غلام معین الدّین گولڑوی کی غزل میں حزن و یاسیت

ڈاکٹر محمد شاہ کھگہ ☆

Dr. Muhammad Shah Khaga

Abstract:

Pir syed Ghulam Moin ud Din Gillani Golarvi,pen named Mushtaaq ,was the grand-son of Pir Mehr Ali Shah Gillani Golarvi(R.A).He is a miraculous poet of the genre of ghazal.His ghazal is more infused with the temperament of Delhi.There is mostly sadness and melancholy and pain and sepration in his poetry ,rather it is his favourite subject.Along with ghazal ,he has composed Hymns,N'aats and Homage to Aulia Allah(R.A).His poetic collection has been published under the title Asrar ul Mushtaaq.

صنف غزل میں اور ادب کے ابتدائی دور میں عاشقانہ اور رندانہ مضامین عام طور پر پیش کئے گئے ہیں۔ غزل میں عشقِ مجازی اور عشقِ حقیقی دونوں ہی ملتے ہیں۔ متقدمین شُعراء نے اس کی بڑی سختی کے ساتھ پابندی کی ہے، عہدِ حاضر میں بھی اکثر لوگوں کی یہی رائے ہے کہ جس شعر میں تغزل نہ ہو وہ غزل کا شعر نہیں ہو سکتا لیکن عام طور پر شعرائے دورِ جدید اس کے پابند نہیں ہیں۔ اب غزل میں سیاسیات، اقتصادیات، مذہب، فلسفۂ اخلاق، وعظ و نصیحت کے علاوہ طرح طرح کے مضامین کو جگہ دی جانے لگی ہے۔ غزل کا دائرہ عہدِ حاضر میں وسیع ضرور ہو گیا ہے۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ جدید رجحانات کی وجہ سے غزل گو شعراء کی تعداد میں کافی کمی ہو گئی ہے۔ اس کے مقابلے میں دیگر اصنافِ سخن مثلاً نظم زیادہ مقبول ہو رہی ہے۔ عہدِ حاضر کے شعراء کی کاروباری اور مصروف زندگی اُنہیں اِس امر کی اجازت نہیں دیتی کہ وہ غزل کے اشعار اپنے قلبی واردات سے مجبور ہو کر پیش کریں۔ اُن کے اشعار بیشتر خیال اور تخیل کا نتیجہ ہوتے ہیں کیوں کہ اُنہیں وہ سکون، وہ عیش اور خوش وقتی کا وہ دور دیکھنا نصیب نہیں ہوا جو شعرائے متقدمین متوسطین اور متاخرین کا دورہ تھا اور جس دور میں انہوں نے اپنی زندگی کے دن گزار کر غزل کی پرورش کی تھی۔

اردو غزل میں معشوق عورت اور مرد دونوں ہی ہوتے ہیں، کبھی معشوق مرد ہوتا

☆ جی سی یونیورسٹی ننکانہ صاحب

ہے کبھی عورت۔ شعرائے اُردو نے فارسی کی تقلید میں معشوق کے لیے مذکر کا صیغہ استعمال کیا۔ اس کی کئی وجوہات ہیں۔اول تو یہ کہ فارسی میں ضمیر ہمیشہ مذکر ہی استعمال کیا گیا، دوسرے ہندوستانی سوسائٹی نے اس بات کی اجازت نہیں دی کہ معشوق کا تذکرہ علی الاعلان کیا جائے۔ تیسرے رسم ورواج کی پابندی نے شعرائے اردو کو مجبور کر دیا کہ وہ اپنے معشوق کا تذکرہ ابہام کے ساتھ کریں۔چوتھے شعراء اپنے معشوق کا اعلانیہ ذکر کر کے اور اس کا نام ونشان بتا کر اُسے بدنام نہیں کرنا چاہتے تھے۔مگر ان کے پیش کرنے کا انداز ہمیشہ یہ بتادیتا ہے کہ شاعر کا معشوق کس صنف سے تعلق رکھتا ہے۔

پیر سید غلام معین الدین گیلانی گولڑویؒ متخلص بہ مشتاقؔ اُردو زبان کے بڑے پختہ شاعر بھی تھے،غزل کے بڑے اچھوتے اور منفرد مضامین پیش کیے ہیں،صنفِ غزل کے علاوہ حمد،نعت اور مناقبِ اولیاءپر بھی بڑی لطیف طبع آزمائی کی ہے۔ خوبصورت شخصیت کے مالک تھے،بڑی جاہ و جلالت چہرے پر تھی۔طبیعت میں غزل کا سامزاج تھا،درد و ہجر اور شاعرانہ کمالات تو آپ کو ورثہ میں ملے تھے،آپ کے دادا قبلہ پیر سید مہر علی شاہ گیلانیؒ فارسی اور پنجابی کے شاعر تھے،اردو زبان میں بھی طبع آزمائی فرمائی۔ آپ کے بڑے صاحبزادے پیر سید نصیر الدین نصیرؔ گیلانیؒ عربی،فارسی، پنجابی اور اُردو زبان کے بڑے قادر الکلام شاعر تھے۔آپ کے پوتے اور درگاہ گولڑہ شریف کے سجادہ نشین پیر سید غلام نظام الدین گیلانی قادری معروف بہ جامیؔ گیلانی صنفِ غزل اور رباعی کے بڑے جاندار شاعر ہیں۔موروثی شاعرانہ صلاحیت اور کمالات کا ذکر پیر سیّد نصیر الدین نصیرؔ گیلانیؒ نے ایک جگہ پر کچھ اس طرح کیا ہے:

> ''مجھے ذوقِ علم وادب ورثے میں ملا۔پر دادا حضرت پیر مہر علی شاہ قدس سرہ،جدِ امجد سیّد غلام محی الدین المعروف بابو جی رحمۃ اللہ علیہ اور والدِ ماجد قبلہ سید غلام معین الدین صاحبؒ المتخلص مشتاقؔ کا شعر و سخن سے لگاؤ باخبر احباب کو اچھی طرح معلوم ہے۔اِس موروثی فیض کے علاوہ بھی یہ سمجھتا ہوں کہ بزرگانِ اُمت اور اساتذہ سخن مولانا رومیؒ،مولانا جامیؒ،خواجہ حافظ شیرازیؒ، طوطیِ ہند حضرت امیر خسروؒ،میرزا عبدالقادر بیدلؒ ایسے نابغہ ءروزگار نفوس کے کلام نے میرے توسنِ فکر کے لیے مہمیز کا کام کیا۔اگرچہ اِن ابرِ اُمت کے علوِ فکر وعفتِ خیال کا جہان ہی کچھ اور ہے۔''(۱)

پیر سید غلام معین الدین گیلانیؒ اَسرار المشتاق میں غزل کا رنگ اصغر گونڈوی، امیر مینائی اور مومنؔ جیسا ہے لیکن کہیں کہیں استاد داغؔ کی سی بھی جھلک ملتی ہے۔ غزل کی شاعری چونکہ کیفیات اور احساسات کی شاعری ہے۔ غزل میں مُے و ساغر، زلف و رخسار اور قد و قامت سب استعارے ہیں۔ ایک صوفی شاعر بھی صنف غزل میں یہی استعارے بڑی شان و شوکت اور تمکنت کے ساتھ استعمال کرتا ہے:

آخر ان کے گیسوئے پُر پیچ میں دل پھنس گیا
خود سرے پن کا زمانے میں یہی انجام ہے
چھوڑ کر زلفیں رُخِ روشن پہ جب وہ سو گئے
میں نے سمجھا صبح ناکامی کی پہلی شام ہے (۲)

دبستان دہلی کا مزاج ہجر و فراق، حزن و ملال، بے وفائی و یاسیت اور محبوب کی بے نیازی ہے۔ فرقت کے لمحات کو من و عن بیان کر دینا، ان کی اولین مجبوری یا ان کا اولین مقصد ہے۔ دہلی کے شاعر کو اس کی اتنی فکر نہیں ہے کہ اس اسلوبِ بیان، طرزِ ادا خوب تر اور حسین ہے یا نہیں بلکہ اس بات کی فکر ضرور ہے کہ اس کے دل کی تپش، اسکی روح کی بے قراری اور قلبی بے اطمینانی کا اندازہ اس کے محبوب کو ہو جائے یعنی دل کی کیفیت بیان کر دینا ہی اس کو تسکین دیتا ہے اور شاید یہی وجہ ہے کہ دہلوی عاشق کو بعض اوقات اپنے عشق ہی سے عشق ہو جاتا ہے۔ معشوق کا پردہ بیچ میں قائم نہیں رہتا، دہلی کے شاعر کی زندگی کا مقصد اور غایت عشق ہی ہے ایسا کیوں ہوا اس کی وجہ یہ ہے کہ وہاں کا معشوق مرد ہے۔ مرد پرستی بھی صوفیانہ خیالات کے باعث قائم ہوئی۔ صوفیانہ عقاید کے مطابق عشقِ الٰہی ان کے منتہائے نظر ہوتا ہے۔

اَسرار المشتاق کی بیشتر غزلیں حزن و ملال اور ہجر و فراق کا مضمون لیے ہوئے ہیں، سید غلام معین الدین گیلانیؒ چونکہ صوفی بزرگ تھے، ان کا عشق یقیناً عشق حقیقی ہے اور ہجر کا انداز ملاحظہ ہو:

فرقت کے جو صدمے سہتے ہیں خاموش پریشاں رہتے ہیں
سُنتے ہیں نہ وہ کچھ کہتے ہیں اک آگ میں جلتے رہتے ہیں
ہر روز تماشہ ہوتا ہے دل خون کے آنسو روتا ہے
اِک یاد تمہاری ایسی ہے ہم جس سے زندہ رہتے ہیں
کیوں آنا جانا چھوڑ دیا کیوں مکھڑا ہم سے موڑ لیا

کیوں عہدِ وفا کو توڑ دیا کیا رسمِ وفا اسے کہتے ہیں (۳)

صوفی شاعر حقیقت میں پر امید ہوتے ہیں لیکن عشق کی اپنی کیفیت ہوتی ہے، عشقِ حقیقی میں وصال کے لیے تڑپنے کا بھی اپنا مزہ ہوتا ہے۔ ہجر و فراق کے لمحات چونکہ طویل ہوتے ہیں اس لیے انتظار بڑا مشکل اور کٹھن ہوتا ہے پھر پُر امیدی کے ساتھ ساتھ نااُمیدی اور مایوسی بھی موضوعِ سخن ہو جاتا ہے۔ اور پھر یہی مایوسی شاعر کے شعر کا حسن بن جاتی ہے۔ مشتاقؔ کی ایک غزل کے چند اشعار ملاحظہ کریں:

او صنم ترے نہ آنے کی قسم کھاتا ہوں میں
اس دل بیتاب کو دن رات سمجھاتا ہوں میں
کیسی آنکھیں پھیر لیں انجان کیسے بن گئے
دیکھ کر ان کی طرف حیران ہو جاتا ہوں میں
دور ہوتے ہوتے آخر دور اتنے ہو گئے
دل میں رکھ کر پھر بھی ان کو دور ہی پاتا ہوں میں
جب کہ ملنے کی کوئی صورت نظر آتی نہیں
لے کے پھر تصویر ان کی دل کو بہلاتا ہوں میں
وہ گلے شکوے گئے وہ پیار کی باتیں گئیں
اب تو ان کو دور سے ہی دیکھتا رہتا ہوں میں
کیا کہوں کس سے کہوں اب کون سُنتا ہے مری
جس کی طرف بھی دیکھتا ہوں غیر ہی پاتا ہوں میں
خوب ہی اچھا کہا مشتاقؔ جس نے یہ کہا
بے وفا کہتے ہیں تجھ کو اور شرماتا ہوں میں (۴)

ایک بڑے دل والے عاشق کا شیوہ اپنے محبوب کو دعائیں دینا ہے۔ وہ جتنا بھی تڑپائے اور ستائے، اعلیٰ ظرفی کا تقاضا ہے کہ اُسے پھر بھی دعا دی جائے اور دردمند عاشق اپنے بے وفا محبوب کو خوش و خرم ہی دیکھنا چاہتا ہے، مشتاقؔ بھی محبوب کو دعائیں دیتے ہوئے دیکھائی دیتے ہیں، ملاحظہ ہو:

تم شاد رہو آباد رہو، ہر حال میں تم خوش حال رہو!
اس حال میں ہم کو رہنے دو جس حال میں ہم اب رہتے ہیں (۵)

صنفِ غزل کے مضامین تقریباً ملتے جلتے ہوتے ہیں،ہر دور کے شاعر نے محبوب کے حسن کی تعریف اور پھر اس سے بچھڑ کر دور رہتے ہوئے رونے ، بلکنے اور سسکیاں لیتے ہوئے آہیں بھرنے جیسے مضامین پیش کیے ہیں۔اُردو شعراءنے فارسی غزل سے مضامین لیے ہیں اور ہر زمانے میں شعراءنے غزل میں وہی موضوعات پیش کیے جو پہلے استعمال ہو چکے تھے۔حقیقت یہ ہے کہ خیال،معانی اور مواد کے لحاظ سے فارسی شاعری کے سرمائے کو بنیاد مان کر جتنی اور جتنے قسم کی عمارتیں قائم کی جاسکتی تھیں،سب قائم ہو چکیں۔روحانی گہرائی بھی آچکی۔وارداتِقلبیہ بھی آچکے ،تصوف،عشقِ حقیقی،عشقِ مجازی،معاملہ بندی،مضمون بندی،خیال بندی ، تمثیل ، نازک خیالی ،رعایتِ لفظی،فارسی تراکیب ،تشبیہات و استعارات کی غرابت،غُلوِ خیال اور غُلوِ خیال ہر ایک چیز برتی جاچکی تھی ،گل و بلبل کی داستانیں،شمع و پروانے کے قصے ، لیلیٰ مجنوں کی کہانیاں ،جفائے ناز،رشکِ اغیار،شوقِ وصل،رنجِ فراق،زلفِ پریشاں، نرگسِ بیمار،سیبِ زنخداں، رندی بادہ خواری،زاہدوں پر طعنوتعریض،غرض کہ مضامین کی ہر صورت سے ضرب و تقسیم کی جاچکی تھی ۔اب ایک شعری انقلاب کی ضرورت تھی،اور وہ نظم بلکہ آزاد نظم کی صورت میں برپا ہوا،ناقدینِ ادب نے کہا کہ غزل اور پھر وہی فرسودہ مضامین ،ان سے دل بھر گیا تھالہٰذا نئے مضامین شعراء کو پیش کرنے چاہئیں، آزاد نظم کی صورت میں نو بہ نو مضامین پیش کیے گئے م لیکن نئے مضامین دلوں کو گرمااور تڑپا نہیں سکے ،اس کی وجہ یہ ہوئی کہ انسان کے سینے میں ایک دل دھڑکتا ہے اور وہ کسی کی یاد سے زندہ رہتا ہے ،انسان کی طبیعت میں موزونیت بھی فطرتِ خداوندی نے رکھی ہے۔ اس موزونیت کو اور دلوں کے تاروں کو چھیڑنے کے لیے صنفِ غزل کا ہی سہارا لیا جاتا ہے۔اس دورِ جدید میں بھی شعراءنے غزل پر طبع آزمائی کرنا نہیں چھوڑا۔پیر سید غلام معین الدین گیلانی گولڑویؒ نے غزل میں وہی اساتذہء سخن والے مضامین پیش کیے ہیں اگرچہ آپ کا زمانہ ماضی قریب ہے یعنی مارچ ۱۹۹۷ء میں اس جہانِ فانی سے عالمِ بقاء کا سفر طے کیا ہے۔لیکن غزل کے مضامین میں وہی ہجر وفراق،حزن و ملال ، آہیں اور آنسو بہانے والے مضامین استعمال کیے ہیں ۔اصل میں انسان کی معراج درد و کرب ہی میں ہے۔ہجر و فراق سے ہی تو انسان کاملیت کے درجہ پر فائز ہوتا ہے۔عشق ایک پاکیزہ اور ارفع جذبہ ہے،علامہ محمد اقبال نے کچھ اس طرح وضاحت کی:

عشق را از تیغ و خنجر باک نیست
اصلِ عشق از آب و باد و خاک نیست (۶)

پیر سیّد غلام معین الدین گیلانیؒ تو عاشقِ صادق تھے م، علامہ محمد اقبال تو ان کے خمیر میں شامل تھا۔ بلکہ آپ کا تو تخلص بھی مشتاقؔ ہے جس کا مطلب ہی عاشق ہے:

عاشق و معشوق و عشق و شوق سے مشتق ہے یہ
واہ اے مشتاقؔ کیا پیارا تمہارا نام ہے (۷)

اسی لیے تو مشتاقؔ برملا فرماتے ہیں:

غمِ فرقت میں مر جانا نہ کچھ کہنانہ کچھ سننا
مزا الفت کا یوں پانا نہ کچھ کہنا نہ سننا (۸)

اسی طرح فرقت میں تڑپنے اور درد سہنے کی کیفیات ملاحظہ ہوں:

تیری فرقت میں کوئی مرتا
رات دن تیری راہ تکتا ہے
یاد جس وقت تیری آتی ہے
اشک بہتے ہیں دل دھڑکتا ہے (۹)

اور ملاحظہ فرمائیں:

تیری فرقت میں اب جینا گراں ہے اس قدر مجھ کو
کہ مرنے کی دوا دیتے ہیں میرے چارہ گر مجھ کو
کسی کی جستجو میں آپ ہی میں کھو گیا ایسا
کہ اب مشتاق مدت سے نہیں اپنی خبر مجھ کو (۱۰)

اسرار المشتاق میں درد و ہجر اور حسرت و یاسیت کا رنگ دیکھئے:

دردِ فرقت، داغِ حسرت، سوزِ غم رشکِ رقیب
اِک دل ناشاد میں کیا کیا ہے پنہاں دیکھئے (۱۱)

ایک اور غزل میں کچھ اس طرح ہے:

تیری فرقت میں مجھ سے اور کچھ تو ہو نہیں سکتا
کبھی رونا ، کبھی ہنسنا، کبھی فریاد ہوتی ہے
نہ مرنے کی اجازت ہے نہ قدموں میں بلاتے ہیں
عجب انداز سے مشتاقؔ پر بیداد ہوتی ہے (۱۲)

پیر سید غلام معین الدین گیلانی گولڑویؒ دراز قامت، خوبصورت شباہت ووجاہت والے شیخ تھے، جاہ و جلال آپ کی شخصیت سے جھلکتا تھا، حسن و جمال کے پیکر تھے، آنکھوں میں ایک عجیب سحر تھا،جو بھی آپ کی آنکھوں کی زد میں آجاتا،وہ چشم پُر فتن کا اسیر ہ جاتا یعنی بچ نہ سکتا۔ لیکن یہ حسین و جمیل شہزادہ غوث الوریٰ اپنے والدِ گرامی قبلہ پیر سید غلام محی الدین بابو جیؒ کا عاشق،اُن کے عشق میں اپنے آپ سے بیگانہ تھا، صبح و مسا قبلہ بابو جیؒ کی محفل چاہتے، قربت و وصال کی جستجو کرتے،ان کے قول و فعل کو اپنانے کی کوشش کرتے، حتیٰ کہ محبوب کی یاد میں، وصل کی آرزو میں شعر کہتے کہتے حقیقت میں مشتاقؔ بن گئے:

آرزوئے وصلِ جاناں میں سحر ہونے لگی
زندگی مانندِ شمع مختصر ہونے لگی
جب چلا مشتاقؔ اپنا کارواں سوئے عدم
یاس ہم آغوشہو کر ہم سفر ہونے لگی (۱۳)

آہستہ آہستہ آپ کی محبت مراحل طے کرتی کرتی یہاں تک پہنچ گئی، ملاحظہ ہو:

شبِ ہجر کی تلخیاں کچھ نہ پوچھو!
نہیں داستاں یہ سنانے کے قابل
وفورِ غم یاس نے ایسا گھیرا
نہ چھوڑا کہیں آنے جانے کے قابل (۱۴)

مشتاقؔ محبت میں اپنے آپ سے بھی بے خبر ہوا اور ان کی آشفتہ سری غزل کے ان اشعار میں ملاحظہ ہو:

ہمدم نہ پوچھ میری محبت کی انتہا
یہ وہ شبِ فراق ہے جس کی سحر نہیں
مدت سے ہم ہیں جس کی محبت میں مبتلا
اس کا یہ حال ہے کہ اسے کچھ خبر نہیں (۱۵)

اور کسی جگہ یہ کیفیت ہے:

مری رودادِ غم سن کر وہ بولے
مزا ملتا ہے تیری داستاں سے

یاد جس وقت تیری آتی ہے
اشک بہتے ہیں دل دھڑکتا ہے (۱۶)

عشق ایک آگ ہے اور اس کی انتہا میں یقیناً خود سے بے خود اور بے گانہ ہو جاتا ہے، کسی کے بس میں نہیں ہے بلکہ یہی ایک عاشق کی معراج ہے:

سب کچھ بھلا چکا ہوں محبت میں آپ کی
اک یاد رہ گئی ہے دل بے قرار میں (۱۷)

جب جامعہ عباسیہ بہاول پور میں تحصیلِ علم کے لیے رہے تو دونوں جانب یہ کسک رہی کہ جلد از جلد وصال ہو، ملاقات ہو، اس ہجر و فراق میں تڑپنے اور سسکنے کی دلیل مکتوباتِ مسافر چند روزہ ہے جس میں ہر مکتوب ثابت کرتا ہے کہ شدتِ عشق کیا چاہتا ہے، یعنی اس شدت نے تمام راز آشکارا کر دیئے ہیں اسی لیے فیضیؔ دکنی نے کہا تھا:

ما اگر مکتوب ننو شتیم عیب ما مکن
درمیان راز مشتاقان قلم نا محرم است (۱۸)

عشق میں تو کچھ ہوش نہیں رہتا، بلکہ ایک پل میں حالت ناگفتہ بہ ہو جاتی ہے، عاشق کو زمانے کی کچھ پروا نہیں رہتی، پھر دیوانگی میں اپنی آشفتہ سری کو واشگاف الفاظ میں بیان کر دیتا ہے۔ مشتاقؔ کی حالت دیکھیں کیا ہو گئی ہے:

کیا سے کیا دو دن میں حالت ہو گئی ہے
دل نہ آیا اک قیامت ہوگئی
آپ تو مشتاقؔ کا چھوڑیں نہ ساتھ
ہو گئی دنیا کو نفرت ہو گئی (۱۹)

ایسی حالت میں جب محبوب صدمہء مفارقت دے جائے تو عاشق کے لیے رستخیز ناگہاں کی سی صورت ہو جاتی ہے یعنی اپنے باپ قبلہ پیر سید غلام محی الدین معروف بہ بابو جیؒ کے انتقال پر یہ سرو قامت عاشق مرجھا گیا اور ہمہ وقت اپنے سینے میں اس کی یاد لیے تڑپتا رہا، روتا رہا۔ احباب اور نیاز مند کہنے لگے کہ اب وہ شباب نہ رہا ہے، ان کی فرقت میں ڈھل گئے، اور اکثر کہتے تھے:

دل تڑپتا رہ گیا اک مرغ بسمل کی طرح

وہ ادا و ناز سے خنجر چلا کر چل دیئے (۲۰)

کسی وقت یہ کیفیت رہی:

کوئی مشتاقؔ ان سے پوچھ کر اتنا ہی بتلا دے
وہ کس سے پیار کرتے ہیں کسے اپنا سمجھتے ہیں (۲۱)

ایک صوفی عاشق، ایک صوفی معشوق کے عشق میں اسی طرح تڑپتا ہے اور اسی طرح اپنے عشق اور درد و فراق کا اظہار کرتا ہے۔ جب وہ روٹھ جاتا ہے تو اس دنیا سے ہی چلا جاتا ہے۔ جب محبوب ہی اس جہاں سے چلا جائے تو پھر یہ جہان اچھا نہیں لگتا، اور یہ اٹل حقیقت ہے، عاشق جتنا بھی پُر امید ہو وہ مایوس ہو جاتا ہے۔ اسی لیے تو یہ کہا ہے، ملاحظہ ہو:

قسمت بھی ہم سے روٹھ گئی اور وہ بھی ہم سے چھوٹ گئے
اِک آس تھی وہ بھی ٹوٹ گئی اب جیتے ہیں نہ مرتے ہیں
مشتاقؔ نہ ہو مایوس ذرا اکِ دن وہ ترا ہو جائے گا
یہ دنیا ہے اس دنیا میں حالات بدلتے رہتے ہیں (۲۲)

باپ چونکہ معشوق اصلی تھا، اس کے دنیا سے چلے جانے سے مشتاقؔ شب و روز روتا اور آہیں بھرتا رہتا تھا، اس لیے مایوسیوں کے بادلوں نے ہر طرف سے گھیر لیا:

اب نہ حسرت ہے نہ کوئی آرزو
دل کے ٹکڑے کر کے وہ جانے لگا
دیکھ کر مشتاقؔ ان کی بے رخی
گلشنِ امید مرجھانے لگا (۲۳)

ایک جگہ مایوسی کا اظہار اس طرح کیا ہے ملاحظہ ہو:

اس کا وعدہ آج تک وعدے کا وعدہ ہی رہا
اک انہ اک کر کے بہانا دل کو بہلاتا رہا (۲۴)

باپ بیٹے کی محبت مثالی تھی، اور دنیا یاد کرے گی۔ جب کوئی اس جہان سے چلا جاتا ہے تو اس کو ملنے کے لیے اُسی جہان میں جانا بہتر ہے۔ لیکن کبھی چاہتے ہوئے بھی نہیں مرا جا سکتا، لیکن کبھی نہ چاہتے ہوئے بھی مر جاتا ہے، مرنے کا کچھ اختیار نہیں اور نہ ہی اعتبار ہے۔

اس فلسفۂ موت کو مشتاقؔ نے اس طرح بیان کیا ہے:

تیری فرقت میں مجھ سے اور کچھ تو ہو نہیں سکتا
کبھی رونا ، کبھی ہنسنا، کبھی فریاد ہوتی ہے
نہ مرنے کی اجازت ہے نہ قدموں میں بلاتے ہیں
عجب انداز سے مشتاقؔ پر بیداد ہوتی ہے (۲۵)

محبوب کی زیارت اور صورت ہی عاشق کے لیے سرمایہ ہوتی ہے۔ جب معشوق دنیا سے چلا جائے تو عاشق کی یہی خواہش ہوتی ہے کہ اب مر کر ہی واصل ہو سکتا ہوں تو پھر وہ دعائیں مانگ کر واصل بہ حق ہو جاتا ہے، یہی عاشق کا وصال ہے اور یہی ملاپ:

میں نے لینا ہے اور کیا تم سے
تری صورت سے پیار ہے پیارے
ترا ملنا اب نہیں ممکن
موت کا انتظار ہے پیارے
قبر مشتاقؔ پر ذرا آو
بے بسی کا مزار ہے پیارے (۲۶)

تو کسی جگہ یہ کیفیت بھی ہوتی ہے:

اس کی میت اور کاندھا ہو ترا
یہ ترے مشتاقؔ کی قسمت کہاں (۲۷)

جب عاشق معشوق پر مر جاتا ہے تو پھر یہ بھی کہہ لیتا ہے:

نصیب اپنے جاگے تو مشتاقؔ مر کر
وہ تربت پہ تشریف لائے ہوئے ہیں (۲۸)

حوالہ جات

۱۔ نصیر گولڑوی، پیر نصیر الدینؒ، ۱۹۸۳ء، (من آنم کہ من دانم) پیمانِ شب، گیلانی پبلشرز، گولڑا شریف، اسلام آباد، ص۱۸

۲۔ مشتاق، غلام معین الدین گیلانی گولڑویؒ، ۱۹۹۹ء، اسرار المشتاق، مکتبہ مہریہ غوثیہ، گولڑا شریف، اسلام آباد ص۶۹

۳۔ ایضاً، ص۹۴

۴۔ ایضاً، ص۹۵

۵۔ ایضاً، ص۶۲

۶۔ محمد اقبال، علامہ، ۱۹۷۲ء، کلیاتِ اقبال فارسی (اسرار خودی)، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، ص۱۸

۷۔ مشتاق، غلام معین الدین گیلانی گولڑویؒ، ۱۹۹۹ ء، اسرار المشتاق، مکتبہ مہریہ غوثیہ، گولڑا شریف، اسلام آباد ص۶۹

۸۔ ایضاً، ص۸۰

۹۔ ایضاً، ص۸۹

۱۰۔ ایضاً، ص۵۴

۱۱۔ ایضاً، ص۶۶

۱۲۔ ایضاً، ص۶۷

۱۳۔ ایضاً، ص۵۳

۱۴۔ ایضاً، ص۵۸

۱۵۔ ایضاً، ص۳۷

۱۶۔ ایضاً، ص۹۱

۱۷۔ ایضاً، ص۵۴

۱۸۔ فیضی دکنی، ابوالفضل، ۱۹۷۰ء کلیات فیضی، نول کشور، دہلی، ص۲۴۰

۱۹۔ مشتاق، غلام معین الدین گیلانی گولڑویؒ، ۱۹۹۹ ء، اسرار المشتاق، مکتبہ مہریہ غوثیہ، گولڑا شریف، اسلام آباد ص۸۰

۲۰۔ ایضاً، ص۸۸

۲۱۔ ایضاً، ص ۶۱

۲۲۔ ایضاً، ص ۶۰

۲۳۔ ایضاً، ص ۶۵

۲۴۔ ایضاً، ص ۶۴

۲۵۔ ایضاً، ص ۶۷

۲۶۔ ایضاً، ص ۹۹

۲۷۔ ایضاً، ص ۶۹

۲۸۔ ایضاً، ص ۷۸